خصوصی مطالعہ

پھر مارشل لا آگیا

محترم پروفیسر عبدالغفور احمد صاحب کی یہ کتاب (۳۴۶ صفحات) جنگ پبلیکیشنز نے کمپیوٹرائزڈ طباعت سے شائع کی ہے۔

سیاسی اکابر نے مارشل لا اور غیر پارلیمانی زندگی کی فرصتوں کو کتاب نویسی میں صرف کیا۔ اور اسٹیج کی دُنیا سے وہ کاغذ کی دُنیا میں آگئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہر شخص کے نقطہ نظر سے تاریخ کے کچھ پہلوؤں کی تصاویر تازہ ہو گئیں اور یہ سرمایۂ نگارش آئندہ کے مؤرخین کو بہت کام دے گا۔ ویسے سیاسی آدمی مستقبل بعید کے مؤرخ سے زیادہ مستقبل قریب کے سیاسی مفاد سے دلچسپی رکھتا ہے اور اسے کچھ حسابات چکانے ہوتے ہیں اور کچھ ناوک افگنیاں بھی۔ اس طرح "یوسفِ بے کارواں" والی کیفیت اور "یاد آیا میکہ" والی حالت دونوں سے فرار والی راہ بھی نکل آتی ہے۔ اب مثلاً ہمارے برادرِ معظم پروفیسر غفور صاحب اس دَور کو کس طرح فراموش کر سکتے ہیں جب کہ وہ قومی اتحاد کے عہدہ دار کے طور پر وقت کے آمر اور اس کی حکومت کے ساتھ سمجھوتوں کی گفتگوؤں میں ایک لمبا عرصہ مصروف رہے۔ بعد میں نہ ان راتوں کا لوٹنا ممکن تھا، نہ ان دنوں کا، لیکن یہ رستہ ضرور رہا کہ وہ سمجھوتے کی ابتداء سے لے کر لبِ بام ناکامی تک کی تاریخ بیان کر سکیں۔ یہ تاریخ آئندہ کے سیاسی لیڈروں کو بھی اور مؤرخوں کو بھی کام دے گی۔ اس لحاظ سے ان کی سعی قابلِ داد ہے۔ واقعات کی ترتیب اور تفصیلی یادداشتوں اور ضروری مسودوں کا یک جا کر دینا کوئی معمولی کام نہیں۔

مصالحتی راستہ بنانے کی کوشش کی کڑیاں یہ سامنے آتی ہیں:

— ۱۳ / مارچ، بھٹو کی طرف سے بات چیت کی دعوت مفتی صاحب کو۔ (ص ۱۱۷)

—— اپریل میں اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار نے ایک فارمولا پیش کیا۔ (ص ۔ ۱۵۰)

——۳؍مئی۔ قومی اتحاد کی تجاویز کا خاکہ حکومت تک پہنچایا گیا۔ (ص ۔ ۱۶۷)

——۴؍مئی۔ اصغر خاں کا پیغام فوج کی ہائی کمان کو کہ وہ ایک فرد (بھٹو) کی غیر آئینی کارروائیوں کا ساتھ نہ دیں۔ (ص ۔ ۱۶۷)

——۶؍مئی۔ قومی اتحاد کا خاکہ تجاویز پریس میں دے دیا گیا۔ (ص ۔ ۱۶۷)

——۲۳؍جون۔ مفتی صاحب کا بھٹو سے استعفیٰ کا مطالبہ (ص ۔ ۲۲۲)

——۲۸؍جون۔ بھٹو صاحب نے قومی اتحاد کے نئے خاکے پر بات چیت کرنے کی آمادگی ظاہر کر دی۔ (ص ۲۲۶)

——۳۰؍جون۔ معاہدہ کی ۳۰ شقوں میں سے پیرزادہ نے ۱۷ پر اپنی رضامندی دے دی۔ (ص ۔ ۲۲۹)

——مسودہ اور ترمیمی اور قومی اتحاد کی آپس میں سخت بحث [1] ص ۲۱۴ ...... ص ۲۴۱)

——آخری گفتگو۔ ۲؍جولائی۔ میاں طفیل محمد: معاملہ لب بام آ پہنچا ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے خراب نہ کریں۔ (ص ۔ ۲۴۳)

——۲؍جولائی۔ بیگم نسیم ولی خاں ۔ من جانب ولی خاں بھی ۔ اصغر صاحب بھی یہ چاہتے تھے کہ معاہدہ نہ کریں، مارشل لا لگنے دیں۔ مفتی صاحب کا انکار۔ (ص ۔ ۲۴۱)

——۲؍جولائی۔ بھٹو ۔ پریس کانفرنس میں سمجھوتہ ہونے کے بعد دس نکات اور بڑھا دیئے ہیں۔ پس معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ (ص ۔ ۲۴۳)

——۴؍جولائی۔ اخبارات اور ریڈیو سے بات آ گئی کہ مذاکرات بحران کا شکار ہو گئے ہیں۔ (ص ۲۴۹)

---

[1] قومی اتحاد کا نفالانہ طریق کار بھی کمال ہے۔ یہ تو ساری سلطنت لے کر بھی شاید بات طے نہ کر سکتے۔ واضح رہے کہ انتخابی اصطلاحات کی رپورٹ کے دس بیس مطالبے بنتے ہیں۔ اسی طرح عام معاہدے کی ۳۰ شقیں تھیں۔ کل کا مورخ یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ قومی اتحاد کے لیڈر بھی مارشل لا کے نفاذ کا بالواسطہ ذریعہ بنے۔

—— ۴ جولائی - اصغر خاں - اب "اس" کے عزائم بڑے خطرناک ہیں۔[۱]

—— ۴ جولائی - قومی اتحاد کے اجلاس میں بدمزگی - اکثریتی تاثر کہ مذاکرات کو توڑا نہ جائے۔ آئندہ جمعہ سے تحریک شروع کی جائے (ص ۲۵۳)

—— ۴ جولائی - رات کھانے کے بعد - نواب زادہ صاحب نے کہا: "وہ بہت دور تک گیا ہے۔ اس نے ہماری تمام باتیں مان لی ہیں لیکن ہم RE-OPEN کرنا چاہتے ہیں - یہ لاسٹ منٹ بارگیننگ (لمحۂ آخر تک کی سودا بازی) ہے" - (ص ۲۵۰)

—— ۴ جولائی - نیم شب، گرفتاریاں —— مارشل لا۔

یہاں آکر پروفیسر صاحب سے سہو ہوا - اس وقت معاملہ دو خطروں کے بیچ لٹک گیا تھا - ایک یہ کہ اسی رات کو (۴ و ۵ کی درمیانی رات) ایف ایس ایف اور تقسیم شدہ اسلحہ اور غنڈہ فورس کو استعمال کر کے مخالف لیڈروں کو قتل کروا دیا جائے، دوسری جانب مارشل لا تھا - فوج نے پہلے خطرے کے لیے میدان کھلا چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا - اور حالات کو گرفت میں لے لیا - یہاں اس فقرے کے معنی سمجھ میں آتے ہیں کہ "اس کے عزائم بڑے خطرناک ہیں" - بلکہ یہ بات ان دنوں بہت شائع و ذائع تھی کہ حکومت نے چند بڑے مخالفین کا صفایا کرنے کا پروگرام بنا لیا جائے۔ سمجھوتہ نہ ہونے کی صورت میں جلد سے جلد اس پر عمل کیا جائے گا - اس فیکٹر کو چاہے یہ غلط ہو یا مبہم زیر بحث لایا جانا چاہیے تھا - اس کے بغیر اس وقت کی پوزیشن اور فیصلوں کو سمجھنا ناممکن تھا۔[۲]

---

[۱] افسوس کہ مؤلف کتاب نے نہ اس کی وضاحت کی اور نہ اس کی مشہوری عام کا کوئی نوٹس لیا اور نہ اس فیکٹر کو مارشل لا لگنے میں محسوس کیا -

[۲] "ایک رات مسٹر کھر اور پیرزادہ نے کہا کہ اپوزیشن شرارت سے باز نہیں آتی - اس کے لیڈر فتنے اٹھا رہے ہیں - ہم ان سب کو قتل کر دیں گے - ٹکا خاں کے لب و لہجہ میں اور بھی تبدیلی تھی - ان کا ارشاد تھا کہ دس بیس ہزار افراد پاکستان کی خاطر (یعنی پیپلز پارٹی گورنمنٹ کی خاطر) قتل بھی کر دینے پڑیں تو کوئی بڑی بات نہیں"

ایک رات کابینہ کی میٹنگ میں جنرل صاحب کو دعوت دی گئی کہ آپ بھی اقتدار میں (باقی بر صفحہ آئندہ)

لیکن بہ حیثیت مجموعی ہمارے برادرِ معظم نے بہت قابلِ قدر کام کیا ہے، عملی سیاست گر ہونے کی وجہ سے کم توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک مربوط کتاب لکھیں۔ لیکن انھوں نے بہت خوب کتاب لکھی اور اس میں ایسی یادداشتیں جمع کر دیں جن کے بغیر کل ہمارے اس دور کی تصویریں مکمل طور پر تیار نہ ہو سکتیں۔

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

شامل ہو جائیں ...... بس ایک بار اپوزیشن کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ (یکم جولائی کی رات)

ایسی ہی باتیں ۲ جولائی کی رات کو بھی ہوئیں۔

بعد میں متعدد ذرائع سے معلوم ہوا کہ مسٹر بھٹو نے مجھے فوج کی سربراہی سے سبکدوش کر دینے کے بارے میں دو تین بار سوچا تھا۔

انٹرویو جنرل محمد ضیاء الحق

برائے اردو ڈائجسٹ۔ گفتگو: الطاف حسن قریشی (مورخہ ۶ ستمبر ۱۹۷۷ء)

خود میری ذاتی یادداشتیں یہ ہیں کہ فوج کے جو آفیسر ڈیوٹی پر تھے، وہ اذانوں کی تحریک کا جائزہ بھی لے رہے تھے اور ساتھ ساتھ عام لوگوں کا ردِ عمل بھی معلوم کر رہے تھے۔ اس وقت دو باتیں عام طور پر مشہور تھیں: ایک یہ کہ ایف ایس ایف کو اسلحہ دے کر تیار کر دیا گیا ہے کہ وہ قومی اتحاد کے لیڈروں کو ختم کر دے اور جب معاہدے کی ناکامی کا مایوس کن تاثر بڑھا تو خاص طور پر ۴ اور ۵ جولائی کی رات کے بارے میں یہ تاثر بڑے اور چھوٹے لوگوں میں عام تھا کہ اسی رات قتل مقاتلہ کرایا جائے گا۔ دوسری بات اس کے ساتھ ساتھ یہ پھیل گئی تو چند لیڈروں کے کہہ دینے کے بعد عام لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ اس بلا سے جان چھوٹے تو ہم مارشل لا کو بہتر سمجھتے ہیں۔

اور اگر ۴/۵ جولائی کی رات کو فوجی ایکشن نہ ہوا ہوتا تو ضیاء الحق صاحب کی چھٹی کے علاوہ ایف ایس ایف کی گولیاں ٹکا خان صاحب کی سالاری میں نہ جانے کس کس دل و جگر میں پیوست ہو چکی ہوتیں۔

سوال یہ ہے کہ قومی اتحاد کی لاتناہی گفتگوؤں کے انتظار میں فوج کیسے بیٹھی رہ سکتی تھی جب کہ قوم کی جانوں پر بنی ہو۔ اسی پہلو سے کتاب میں ضروری ورق خالی رہ گیا۔

اب ذرا دوسرا پہلو!

بعض لوگوں نے قومی اتحاد اور بھٹو حکومت کے درمیان ہونے والی مصالحتی گفتگوؤں کو نظیر اور دلیلِ جواز بنایا ہے[1] پروفیسر غفور صاحب اور جماعت کے بعض دیگر پالیسی ساز اکابر کی حالیہ گفتگوؤں کے لئے جو انہوں نے پچھلے کچھ عرصہ میں پیپلز پارٹی سے جاری رکھیں اور پھر جن سے ایسے نتائج برآمد ہوئے جنہوں نے ہمارے کام پر برا اثر ڈالا۔

اعتراض ہوتے پر کہا گیا کہ پیپلز پارٹی سے تو ہم پہلے بھی گفت و شنید اور معاہدانہ کوششیں کرتے رہے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ لوگوں میں اتنی منطق نہیں پائی جاتی کہ وہ ایک نظیر یا دلیل یا تشبیہ کا انطباق کسی دوسرے معاملے پر کرتے ہوئے فوراً اس وجہ مغالطہ انگیزی کو پکڑ لیں جو چھپی چھپائی رہتی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ اس ناکام معاہدے کی مساعی میں جماعت اسلامی کی ذمہ داری کہاں تک ہے؟ بس اتنی ہی کہ نو میں حصے کی حد تک ادھر کا ایک آدمی بھی شریک تھا۔ ورنہ اس قصے کا کوئی تعلق جماعتی اصول روایات اور نظم اور ریکارڈ سے نہ تھا۔ پھر بھی واضح قسم کا ٹکراؤ ہماری روایات اور اقدار سے نہ تھا۔

دوسرا قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ وہاں بات چیت ایک حکومت سے تھی اور ایسی بات چیت ہر حکومت بلکہ لادین حکومت حتیٰ کہ تاتاریوں اور خارجیوں کی حکومت سے بھی ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ جو حکومت عملاً (DEFOCTO) مسلط ہو، اس پر چونکہ ایک اہم رشتہ (جبراً سہی) عوام اور شہریوں سے قائم

[1] جواز نکالنے والے بھی کمال کرتے ہیں۔ بعض اصحاب نے حالیہ قضیۂ مفاہمت پر "صلح حدیبیہ" کے قصے کو چسپاں کر ڈالا، جسے نبیؐ اکرمؐ نے خدا کی ہدایت کے مطابق انجام دیا۔ کہاں نبیؐ، کہاں اس کے مقدس ساتھی، اور کہاں ہماری پستیاں۔ نبیوں کے کاموں کو اپنے اوپر چسپاں کرتے ہوئے احتیاط کرنی چاہیے۔ خدانخواستہ اونچے مقدس واقعات کو ہم مذاق بنا کر رکھ دینے کی گستاخی کے مرتکب نہ ہوں۔

یہاں پھر بڑی مغالطہ انگیزی ہے۔ حضورؐ قریش سے یہ طے کرنے نہیں آئے تھے کہ ہم مل انتخاب لڑیں یا حکومت چلائیں گے۔ وہ تو طواف کے لیے مکے میں جانے کے لیے آئے تھے۔ اس پر دشمن قوت نے سمجھوتہ یہ کیا کہ اگلے سال آپ طواف کر سکتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ دوسری شرائط بھی تھیں۔

ہو جاتا ہے اور شہریوں کے حقوق کے علاوہ روزمرّہ کے دوسرے معاملے اس سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا سلطانِ وقت یا حاکمانِ وقت سے بات کرنا اور چیز ہے۔ مثلاً کسی شخص کو راشن کارڈ بنوانا ہے، یا پاسپورٹ لینا ہے، بچے کو داخل کرانا ہے تو اس حکومت کے ایک شعبے میں جائے گا ـــ وہاں کام نہ ہو یا خراب ہو تو وہ اُوپر یا اُس سے اوپر اور بالآخر حاکم اعلیٰ تک پہنچنے کی یا کوشش کرے گا۔

دوسری طرف یہ معاملہ بالکل الگ ہے کہ آپ ایک یا دو پارٹیوں سے مل کر انتخابی سمجھوتہ کریں اور وہی انتخاب جس کو آپ جہاد کہتے ہیں وہ ایسے لوگوں کے ساتھ لین دین کر کے لڑیں، جو مخالفینِ اسلام لادینیت کے علمبردار، فسطائیت و آمریت کے مجرم، قتل اور غنڈہ گردی کے ذمہ دار، قومی دولت پر علانیہ ہاتھ صاف کرنے والے اور ہجومی سیاست کے مظاہروں میں حرکات و سکنات اور سلوگنوں اور نعرہ بازی کے لحاظ سے غیر شائستہ ہوں۔ ان لوگوں کے ساتھ کسی قومی اتحاد میں شریک ہو کر یا براہِ راست ہم آہنگی یا ہم پیالگی و ہم نوالگی، یا ہم قدمی و ہم نوائی پیدا کرنا حق و باطل میں التباس پیدا کر کے عوام کو اس سے مایوس کرنا ہے کہ اسلام کے کوئی اصول اور اس کی قدریں اور ضابطۂ معاملات مستقل اور دائمی بھی ہیں۔ یا قرآن کے آدمی اور محمد رسول اللہ کے نقیب و مجاہد کا کوئی غیر متبدل مزاج بھی ہوتا ہے۔

معذرت خواہ ہوں کہ مجبوراً اس اہم کتاب کے تبصرے کے خاتمے پر یہ متعلقہ مسئلہ مجھے چھیڑنا پڑا۔ ایک اور کمی اس اہم کتاب میں رہ گئی ہے۔ وہ یہ کہ جماعتِ اسلامی جن اتحادوں اور متحدہ محاذوں میں شریک ہوتی رہی۔ ان کے خطوطِ اتحاد میں ایک نہ ایک جامع شق ہمارے اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق موجود رہتی۔ جمہوریت وغیرہ سب ثانوی درجے پر ہوتیں، جنہیں بعض دوسرے لوگ اولیت دیتے ہوں گے۔ مگر ہم سب پہلے اسلامی بنیاد کو تسلیم کرا لیتے تھے۔ پروفیسر صاحب اپنی کتاب میں جہاں پاکستان قومی محاذ کے قیام (مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۷۰ء) کا ذکر کیا ہے (ص ۸۶) وہاں سرے سے اساسیاتِ اتحاد کا ذکر نہیں، یہ بہت ضروری تھا۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ آج بہت سے لوگ سیاست بلا دین یا ایسی سیاست جس میں دین کی کم سے کم

(باقی برصفحہ ۴۵)

(بقیہ صفحہ ۲۷)

مداخلت ہو، یا مغرب کی لادینی ساخت کی مروجہ جمہوریت کو فی نفسہ اولیت دینے لگے ہیں اور دینی پوائنٹ اتحادی خاکوں اور گفتگوؤں سے تقریباً خارج ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغربی سیاست و جمہوریت اگر دینی اصلاحات کے بغیر فی نفسہ مقصود بن جائے اور اُسے چلایا جائے تو نتیجے میں بدترین آمریت و فسطائیت کے علاوہ بدتر لادینیت بھی نمودار ہو سکتی ہے۔

بنابریں یہ پوائنٹ بہت ہی اہم تھا کہ واضح کیا جائے کہ کن موسسات پر قومی اتحاد قائم ہوا تھا۔

نوٹ: یہ دستاویزی کتاب فاضل مؤلف کی طرف سے راقم کو ہدیہ کی گئی جس کے لیے میں بہت شکر گذار ہوں۔